© rasailojaraid.com

محمد اسحاق بھٹی

# مولانا محمد حنیف ندوی کا سفرِ آخرت

مولانا محمد حنیف ندوی جن کو مرحوم کہتے ہوئے زبان تھرتھراتی اور لکھتے ہوئے ہاتھ لرزتا ہے، تقریباً ڈھائی سال کی مسلسل اور طویل علالت کے بعد ۱۲۔ جولائی ۱۹۸۷ء کی شب کو نو بج کر چالیس منٹ پر اس دُنیائے فانی سے رخصت ہوگئے۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

بیماری کے دورِ آغاز میں مولانا کا خیال تھا کہ انھیں مثانے کا درد ہے۔ معالجوں سے رجوع کیا گیا تو اُنھوں نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا اور عرصے تک اسی تشخیص کے مطابق علاج ہوتا رہا۔ ایلوپیتھی، یونانی اور ہومیوپیتھی تینوں قسم کے علاج کرائے گئے اور اس مرض کے ماہر معالجوں سے کرائے گئے، مگر افاقہ نہ ہوا۔ کبھی کبھی اتنا فرق ضرور پڑتا تھا کہ درد میں قدرے کمی آجاتی تھی۔ درد کا تسلسل کبھی نہیں ٹوٹتا۔

دو تین دفعہ ایسا بھی ہوا کہ بعض ڈاکٹروں نے مثانے کے اپریشن کا ارادہ کیا، اس کے لیے تاریخ اور وقت کا تعین بھی کر دیا گیا، مگر ہر دفعہ عین موقعے پر ارادہ بدل دیا گیا اور دواؤں کے ذریعے علاج جاری رکھنا مناسب سمجھا گیا۔

مولانا ۱۲ر اکتوبر ۱۹۸۶ء کو ادارہ ثقافت اسلامیہ تشریف لائے۔ میں نے عرض کیا، میں کل ۱۳ر اکتوبر کو آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ فرمایا کل تو میں اسلام آباد چلا جاؤں گا، پھر کل ہی وہاں سے علاج کے لیے لندن روانہ ہو جاؤں گا۔ یہ ہم سب کے لیے ان کی اچانک اطلاع تھی۔ وہ ملاقات کے لیے آئے تھے اور سب سے الگ الگ ان کے کمروں میں جا کر ملے۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے میں آئے تو میں نے عرض کیا کہ آپ نے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں جو تصنیفی خدمات انجام دی ہیں، ان سے متعلق "ارمغان حنیف" کے لیے میں نے مضمون لکھا ہے، اجازت ہو تو ایک صفحہ سنا دوں، فرمایا "سناؤ" ایک صفحہ سُنا چکا تو عرض کیا "بس کروں"؟ فرمایا "اور سناؤ"! مضمون کے شروع اور آخر کے فل سکیپ کے مسودے کے سات صفحے سُنے اور نہایت خوش ہوئے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



فرمایا "آپ نے بہت اچھا لکھا ہے اور میرے انداز میں لکھا ہے۔ مر جاؤں تو افسوس نہیں ہوگا، کام تو انشاءاللہ زندہ رہے گا۔"

۱۳۔ اکتوبر ۱۹۸۶ء کو اپنے ذرائع سے علاج کے لیے وہ لندن چلے گئے۔ ان کی اہلیہ محترمہ بھی ساتھ گئیں۔ وہاں جا کر سب سے پہلے مثانے کی بیماریوں کے سپیشلسٹ ڈاکٹر سے رابطہ قائم کیا گیا۔ اس نے مختلف ٹیسٹ لیے تو اس نتیجے پر پہنچا کہ انھیں مثانے کی تکلیف نہیں ہے بلکہ معدے کا عارضہ ہے۔ چنانچہ اس کے مشورے سے معدے کی بیماریوں کے ماہر ڈاکٹر سے رجوع کیا گیا۔ اس نے کئی قسم کے ایکسرے لینے اور تجزیے کرنے کے بعد بتایا کہ جس آنت کے ذریعے معدے کو خوراک پہنچتی ہے وہ آنت سکڑ گئی ہے۔ اس کے لیے اس نے غذا بھی بتا دی اور ضروری دوائیں بھی لکھ دیں۔

لندن کے ان دونوں ڈاکٹروں کو معلوم ہو چکا تھا کہ اس مریض کی حیثیت پاکستان کے گراں مایہ علمی سرمائے کی ہے اور یہ قدیم و جدید فلسفے میں مہارت رکھتے ہیں۔ اس لیے وہ ڈاکٹر خود بھی ان کا بہت احترام کرتے تھے اور ماتحت عملے کو بھی ان کی دیکھ بھال کے لیے خاص ہدایات جاری کر دی تھیں۔

امراض معدہ کے ماہر ڈاکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ ان کے پیشاب کا تجزیہ کیا گیا تو اس میں کینسر کے جراثیم پائے گئے ہیں، لیکن ان کے مرکز کا پتا نہیں چل سکا۔ یہ بھی لکھا تھا کہ چند ماہ تک پیشاب کی نالی میں رسولی پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ لیکن اس رپورٹ کا آخر وقت تک مولانا کو علم نہیں ہو سکا۔

تقریباً تین مہینے کے بعد، ۷ جنوری ۱۹۸۷ء کو مولانا لندن سے لاہور واپس آئے۔ ایئرپورٹ پر استقبال کے لیے ان سطور کا راقم بھی موجود تھا۔ صحت بظاہر اچھی تھی۔ میں نے بغل گیر ہوتے ہوئے ان سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے، آپ نے لندن جانے کے لیے بیماری کا بہانہ بنایا تھا۔ میاں بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا وہاں بھی بعض لوگ یہی کہتے تھے۔

لندن سے واپس آنے کے بعد علاج کا سلسلہ وہاں کے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق بدستور جاری رہا۔ اس اثنا میں وہ دو تین مرتبہ ادارہ ثقافت اسلامیہ بھی تشریف لائے، میں بھی گھر پر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ کمزوری تو تھی، لیکن بظاہر زیادہ خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔

میں نے ایامِ مرض میں کئی دفعہ ان سے عرض کیا کہ صحت اچھی ہو جائے تو اپنے ایک پرانے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مضمون "چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں" کے آخری پندرہ بیس صفحے لکھ دیجیے تاکہ یہ مکمل ہو جائے اور اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے۔ اُنھوں نے بشرطِ صحت لکھنے کا وعدہ بھی فرمایا۔ لیکن جون کے پہلے ہفتے میں طبیعت یکایک خراب ہو گئی اور ضعف و مرض نے ان کے جسمِ ناتواں کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا۔

ابتدا میں مختلف ڈاکٹروں کا علاج ہوتا رہا، لیکن جون کی آخری تاریخوں میں اُنھیں لاہور کے اتفاق ہسپتال کے جنرل وارڈ میں داخل کرا دیا گیا۔ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر جناب سراج منیر کو پتا چلا تو وہ ہسپتال پہنچے اور فوری طور پر ملک فیض الحسن (زکوٰۃ کونسل پنجاب) اور خالد شیرازی (ریڈیو پاکستان لاہور) سے ملے اور ان سے مولانا کی شدید بیماری کے بارے میں بتایا۔ انھوں نے ہسپتال کی انتظامیہ کے بعض معزز ارکان سے رابطہ قائم کیا اور مولانا کو ہسپتال کے وی آئی پی روم میں منتقل کرایا گیا۔ ان حضرات کی کوشش سے ہسپتال کی انتظامیہ نے علاج معالجے کی ذمہ داری خود قبول کر لی اور ماہر ڈاکٹروں کی نگرانی میں ان کا علاج ہونے لگا۔

پیشاب کی نالی کے بجائے پیٹ میں رسولی پیدا ہو گئی تھی، اس کا چھوٹا سا ٹکڑا کاٹ کر تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کینسر ہے، مگر قابلِ علاج ہے۔ اس کے بعد طبیعت کچھ سنبھل بھی گئی، لیکن یہ عارضی بات تھی۔

۹۔ جولائی کو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھ کر مسکرائے اور خیر خیریت پوچھی۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھا اور چند ثانیوں کے بعد غنودگی طاری ہو گئی۔ اسی دن شام کو میں نے ان کے چھوٹے صاحب زادے حماد سے ہسپتال میں ٹیلی فون پر رابطہ کیا تو انھوں نے کہا آپ کے جانے کے بعد ابّی کہہ رہے تھے کہ آپ ان کی عیادت کے لیے ہسپتال نہیں آئے۔ اُنھیں بتایا گیا کہ آپ آئے تھے تو فرمایا نہیں آئے۔ پھر بتایا گیا کہ آئے تھے اور آپ سے ایک آدھ بات بھی ہوئی تھی تو "اچھا" کہہ کر خاموش ہو گئے۔

۱۰۔ جولائی کو گیارہ بجے کے قریب میں ہسپتال گیا تو بظاہر طبیعت اچھی تھی اور مولانا کرسی پر بیٹھے تھے۔ اپریشن کے مقام پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کچھ باتیں بھی کیں، پشت پر رکھنے کے لیے مجھ سے تکیہ بھی مانگا۔ بعض اور دوست بھی آ گئے، اُنھوں نے خیریت پوچھی تو فرمایا۔ الحمدللہ ٹھیک ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



۱۱- جولائی کو حاضرِ خدمت نہیں ہو سکا ۔ ۱۲ر جولائی کو میں دفتر نہیں گیا ، گھر پر ہی رہا - خیال یہ تھا کہ شام کو مولانا کی خدمت میں حاضری دوں گا - لیکن ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر سراج منیر نے دفتر سے ٹیلی فون کیا اور پوچھا کہ "کل آپ مولانا کے پاس گئے تھے ؟" عرض کیا "کل نہیں جا سکا ، آج شام کو جانے کا ارادہ ہے ۔" اُنھوں نے بتایا کہ "کل دوپہر سے ان کی طبیعت بہت خراب ہے اور بے ہوشی کی حالت میں ہیں ۔"

یہ تشویش ناک خبر تھی - میں اسی وقت گھر سے نکلا اور دفتر پہنچا ۔ پانچ بجے کے قریب سراج منیر صاحب ، جناب ذوالفقار احمد ، ملک فیض بخش اور ان سطور کا راقم ہسپتال پہنچے تو دیکھا کہ علم و فضل کا یہ کوہِ گراں اپنی جگہ سے ہل چکا ہے اور زندگی کے آخری سانس لے رہا ہے ۔ ڈاکٹر انتہائی توجہ سے مصروفِ علاج ہیں اور اعزہ و اقارب تصویرِ یاس بنے ہوئے کمرے میں ان کے ارد گرد بیٹھے ہیں ۔

مجھ کو دیکھتے ہی پہلے ان کا چھوٹا بیٹا حماد میری طرف بڑھا اور چمٹ کر رونے لگا - پھر چھوٹی بیٹی سدرہ آئی اور روتے ہوئے بولی "چاچا ! اب کیا ہوگا ؟" (ان کے بچے مجھے چاچا کہتے ہیں ) اس وقت خود میری حالت دِگر گوں تھی اور میرے پاس افسوس سے ، تلقینِ صبر کے چند الفاظ کے سوا کچھ نہ تھا ۔ وہ ایسی تکلیف دِہ گھڑی تھی کہ سب کی آنکھیں پُر نم تھیں اور چہروں پر مایوسی چھائی ہوئی تھیں ۔

شام کو ہم ہسپتال سے واپس لوٹے تو سراج منیر صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم سیدھے گھر جاؤ اور ٹیلی فون کے ذریعے ان سے رابطہ رکھو - میں بھی رابطہ رکھوں گا ۔ سب کو معلوم تھا کہ یہ زندگی کے آخری سانس ہیں اور چند گھڑیوں تک جسم و جان کا ۹۷ سالہ پرانا تعلق ٹوٹنے والا ہے ۔ بہر حال گھر جا کر میں نے ہسپتال سے رابطہ قائم رکھا اور رات کو ساڑھے نو بجے سے چند منٹ بعد حزن و ملال میں ڈوبی ہوئی یہ آخری اطلاع ملی کہ فضل و کمال کا یہ پیکر اس عالمِ خاکی سے مُنہ موڑ کر جنت کو روانہ ہو گیا ہے ۔ قرآن کا یہ مفسر اور حدیثِ نبوی کا یہ محبؒ صادق چشمۂ کوثر پر جا بیٹھا ہے - چند گھنٹوں سے وہ جس کوفت میں مبتلا تھا ، وہ دور ہو گئی ہے ، اب وہ باغِ بہشت میں جا کر آرام کی نیند سو گیا ہے ۔

یہ خبر سنتے ہی گزشتہ اڑتیس برس کے لمحاتِ زندگی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھومنے لگے اور یکے بعد دیگرے بے شمار یادیں تازہ ہو گئیں ۔

ان کی وفات کی اطلاع پا کر اخلاقاً مجھے ان کے گھر جانا اور وہیں رات رہنا چاہیے تھا ۔ لیکن

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



میں نے ان کے لڑکوں سے کہہ دیا کہ میں نہیں آؤں گا، اس لیے کہ اب اخبارات کو ان کی وفات کی اطلاع دینا، ان کی زندگی کے حالات بتانا اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات کی تفصیلات سے مطلع کرنا ضروری تھا اور میرے سوا کوئی اور یہ فریضہ انجام دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ چنانچہ تمام اردو انگریزی اخبارات اور خبر رساں ایجنسیوں کو مناسب تفصیل سے اطلاع دی گئی، ان کے حالات بتائے گئے، ان کی علمی، تحقیقی اور تصنیفی تگ و دو سے مطلع کیا گیا اور اخبارات کے طلب کرنے پر ان کی مختلف تصویریں مہیا کی گئیں۔ تمام رات اخبارات سے رابطہ رکھا اور انھوں نے جو کچھ پوچھا، بتایا۔

صبح ۱۳۔ جولائی کے اخبارات میں صفحۂ اوّل پر نمایاں طور سے ان کی خبرِ وفات شائع ہوئی۔

اسی صبح کو ساڑھے چھ بجے سراج منیر صاحب نے ریڈیو پاکستان لاہور کے خصوصی پروگرام میں دس منٹ ان کے بارے میں تقریر کی اور ان کے ضروری حالات وضاحت سے بیان کیے۔ (یہاں یہ عرض کر دوں کہ صبح ساڑھے چھ بجے کے پروگرام میں ریڈیو پاکستان، لاہور سے روزانہ کئی روز سے سراج منیر اور خالد شیرازی مولانا کی بیماری کی تازہ ترین صورتِ حال کے بارے میں اعلان نشر کر رہے تھے۔)

مولانا حنیف ندوی نے ۱۲۔ جولائی ۱۹۸۷ء (۱۵۔ ذیقعدہ ۱۴۰۷ھ) کو اتوار کے دن رات کو نو بج کر چالیس منٹ پر وفات پائی اور دوسرے دن گیارہ بجے ان کا جنازہ اٹھایا گیا، اور انھیں کلفٹن کالونی (وحدت روڈ) کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔ نمازِ جنازہ مسجد مبارک کے خطیب مولانا فضل الرحمٰن نے پڑھائی۔

علمی اعتبار سے گزشتہ کئی سال سے واقعات نے جو رخ اختیار کر لیا ہے، اس کو دیکھتے ہوئے آئندہ بظاہر حالات برصغیر پاک و ہند میں علم و عرفان کی اس قسم کی مثال پیدا ہونے کی توقع نہیں۔ وہ قدیم و جدید کے پیکرِ حسین اور کائناتِ فضل و کمال تھے۔ مفسرِ کتابِ ہدیٰ، فنونِ نقلیہ و عقلیہ کے ماہر، خزانۂ علومِ قرآن، محبِّ رسولِ عربی، دلدادۂ حدیثِ نبوی، حاضر جواب، مقررِ شیریں بیان، خطیبِ نکتہ طراز، خلوت گزیں مجمعِ کمال اور گوشہ نشیں محفل آرا، دنیا اور اہلِ دنیا سے بے نیاز، دولت و ثروت سے مستغنی، لوگوں کی داد و تحسین سے بے پروا، عربی کے ادیب، اردو کے صاحبِ طرز مصنف، متوکل علی اللہ، مجسمۂ فہم و تدبر، اسلامی فلسفے میں یکتا، عمرانیات و علومِ حاضر میں منفرد، اور علم و مطالعہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کے علاوہ ہر شے سے بے تعلق ـــ!

یہ قناعت پیشہ صاحبِ علم و ہنر، جسے اس عالمِ خاکی میں محمد حنیف ندوی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا بے شمار خصوصیات کے حامل تھے۔ وہ عملاً اپنے نام "حنیف" کا صحیح ترین ترجمہ تھے۔ یعنی سب معاملاتِ غیر علمی سے کٹے ہوئے اور امورِ ناپسندیدہ سے الگ تھلگ۔! اگرچہ مال و دولت سے تہی داماں تھے مگر اقلیم علوم و فنون پر ان کی حکمرانی تھی۔ یہ وہ خوش قسمت عالم دین ہیں جن کا علم ان کے سینے میں بند نہیں رہا اور ان کے ساتھ ہی قبر میں دفن نہیں ہو گیا بلکہ کثرت کے ساتھ کاغذ کے سفینے میں منتقل ہوا، اور صفحاتِ قرطاس نے ہمیشہ کے لیے اسے اپنے دامن میں محفوظ کر لیا۔

اس گراں مایہ ہستی کو اپنے اوصافِ گوناگوں اور کمالاتِ بوقلموں کی بنا پر موجودہ کاروانِ علم کا آخری مسافر کہنا چاہیے۔ یہ انگریزی کالجوں اور مغربی طریقِ تعلیم کی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ نہیں تھے، بلکہ عربی مدارس کے بوریا نشین گروہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس طائفۂ انکسار کے رکن تھے جو مسجدوں کی چٹائیوں پر گلیم پوش اور درویش منش اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے ہیں۔

اس مردِ قلندر نے گوجرانوالہ کی ایک مسجد سے تعلیم کا آغاز کیا اور وہیں درسِ نظامیہ کی تکمیل کی۔ پھر وہاں سے لکھنؤ گئے اور ندوۃ العلما میں داخلہ لیا۔ پانچ سال ندوہ میں رہے۔ یعنی ان کے معلومات کا ابتدائی سرمایہ عربی مدارس کا رہینِ منت ہے۔ اس مردِ فقر پیشہ نے مسجد کی چٹائیوں سے اُبھر کر اپنی خداداد ذہانت اور کثرتِ مطالعہ سے فلسفہ و منطق کی بلند و بالا چوٹیوں کو سر کیا۔ ان کا کمال یہ ہے کہ علم و ادراک کے اسلحہ سے مسلح ہو کر یونان کے فلاسفہ اور اصحابِ منطق کے افکار و تصورات کے صنم کدوں کی خبر لائے۔ پھر ان کے بعض نظریات پر اس درجے زوردار حملے کیے کہ اس کی ضربیں برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی کے ایوانوں میں سنی گئیں اور ان کے تحلیل و تجزیہ کے بہت سے حصوں کو انگریزی کے قالب میں ڈھالا گیا۔

فلسفے پر ان کے عبور کا یہ عالم تھا کہ وہ ۱۹۵۴ء سے فلسفہ کانگریس کے رکن تھے جو دُنیا بھر کے فلسفیوں کی نمائندہ جماعت ہے۔ اس کے اجلاسوں میں وہ جاتے اور مقالے پڑھتے تھے، یہ مقالے دیگر فلاسفہ کے مقالات کے ساتھ کتابی شکل میں چھپ چکے ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں فلسفہ کانگریس کا جو اجلاس پشاور میں ہوا تھا، اس کے مولانا صدر تھے، اس کا افتتاح صدرِ پاکستان جنرل ضیاء الحق نے کیا تھا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اور مولانا نے اس میں صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔

مولانا کا فلسفے کا ذوق بہت پرانا ہے۔ تمام یونانی اور مغربی فلاسفہ کی کتابیں نہ صرف مولانا نے پڑھی ہیں بلکہ اپنے بہت سے مضامین میں ان کو ہدفِ تنقید بنایا ہے اور ان کے بعض فلسفیانہ نظریات پر چبھتے ہوئے اعتراضات کیے ہیں۔ ان اعتراضات اور تنقیدات میں جو وزن اور زور ہے، اس کا اندازہ مختلف کتابوں میں پھیلی ہوئی ان کی تحریروں سے ہو سکتا ہے۔

مولانا کے فلسفے کے سلسلے میں یہاں ایک دلچسپ واقعہ بھی سننے جایے۔ ۱۹۴۹ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ مولانا حنیف ندوی مسجد مبارک میں خطبۂ جمعہ ارشاد فرما رہے تھے۔ دورانِ خطبہ میں زیرِ تلاوت آیت کے ضمن میں مشہور فلسفی کانٹ کے فلسفے کا کوئی نظریہ بحث کی زد میں آ گیا اور مولانا نے قرآن کی رو سے فلسفیانہ انداز میں اس کو محلِ نقد و جرح ٹھہرایا۔ اس وقت مولوی محمد ابراہیم صاحب جو جج تھے اور عام طور پر مولانا کی اقتدا میں نمازِ جمعہ ادا کرتے تھے، خطبے میں موجود تھے۔ وہ بڑی وجاہت اور بارعب شخصیت کے مالک تھے اور علم فلسفہ سے شناسا تھے۔ وہ یہ توقع نہیں رکھتے تھے کہ مسجد کا ایک خطیب فلسفے کی زبان میں کانٹ کے فلسفیانہ افکار کو تنقید و اعتراض کا ہدف بنا سکتا ہے۔ خطبہ ختم ہوا اور نمازِ جمعہ ادا ہو چکی تو جج صاحب مولانا کے پاس آئے اور بطریقِ نصیحت فرمایا کہ آپ کو خطبے میں دینی مسائل بیان کرنے پر اکتفا کرنا چاہیے، فلسفے کے نازک مباحث میں نہیں پڑنا چاہیے۔

اس واقعے پر اڑتیس برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے، لیکن یہ منظر اب بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ مسجد کے بہت سے نمازیوں کے علاوہ اس وقت اسلامیہ کالج کے چند اساتذہ اور طلبا بھی وہاں موجود تھے۔ جج صاحب نے مولانا سے فرمایا:

"آپ فلسفہ جانتے ہیں"؟

مولانا نے کہا! "آپ کو یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی"؟

جج صاحب بولے، "آپ نے کانٹ کے فلسفے کے بارے میں جو کچھ بیان کیا ہے، اس کی ضرورت نہ تھی"۔

مولانا نے پوچھا! "آپ کو میری کس بات پر اعتراض ہے"؟

جج صاحب نے اپنے اندازِ خاص سے کچھ سوال کیے تو مولانا نے جواب دینا شروع کیا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اس منہج سے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھایا کہ مولوی ابراہیم جج کو سوائے خاموشی اختیار کرنے کے مولانا کی گرفت سے نکلنے کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آیا۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ مولانا سے کچھ سیکھنے کے اسلوب میں بات کرتے اور مؤدب ہو کر ان کی مجلس میں بیٹھتے۔

محمد حنیف اپنے جسمِ نحیف میں ایک جہانِ دانش سمیٹے ہوئے تھے اور اُن کے تن زار میں ایک دنیائے علم آباد تھی۔ اُن کی خلوت میں معارف و ہنر کی بہت سی جلوتیں پنہاں تھیں، ان کی تنہائی کئی مجلسوں پر بھاری تھی، ان کی گوشہ نشینی کتنی ہی محفلوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے تھی، ان کی خاموشی میں انتہا درجے کا تلاطم تھا، ان کے سکوت میں تکلم کے بے شمار بھید مضمر تھے، ان کی قلندری کے حضور سکندری سرنگوں تھی اور ان کی فقیری کے آگے میری کی گردن جھکی رہتی تھی۔ ان کی زبان کی جنبش سے لؤلوئے لالہ بکھرنے لگتے اور قلم کی حرکت سے الفاظ کی شکل میں کاغذ پر موتیوں کی بارش ہونے لگتی۔

ان کی خصوصیت یہ تھی کہ منکسر کے سامنے انکسار اور نرمی کا پتلا بن جاتے اور اگر کوئی غرور اور نخوت کا اظہار کرتا تو ان کے لہجے میں فوراً سختی اور خودداری کا عنصر ابھر آتا۔ میدانِ علم میں کسی سے دب کر بات کرنا یا مرعوب ہونا ان کا شیوا نہ تھا۔ وہ کسی کو اپنا حریف نہ سمجھتے تھے نہ بناتے تھے، لیکن اگر کوئی حریف کا روپ دھار کر سامنے آتا تو اس سے کئی قدم آگے بڑھ کر بات کرتے۔ آبروئے علم کی حفاظت کرنا اور علما کے صحیح وقار کو ملحوظِ خاطر رکھنا وہ اپنا فرض سمجھتے تھے۔ لیکن جو علما علم کو مادی منافع اور عاجل فوائد کے حصول کا ذریعہ بناتے ہیں، ان سے وہ سخت نفرت کا اظہار کرتے تھے۔

اُنھوں نے علم و فن کے ہر دشت کی سیاحی کی اور فضل و کمال کے ہر گلستان کی سیر کو اپنا وظیفۂ حیات قرار دیا۔ جب تک صحت نے اجازت دی وہ طلبِ علم اور مطالعۂ کتب میں مصروف رہے، اور یہی جذبہ ان کے معلومات کی وسعت کا باعث ہوا۔

قرآن سے متعلق اُنھوں نے تین مستقل کتابیں لکھیں جو کم و بیش تین ہزار صفحات پر مشتمل ہیں۔

ان میں سے ایک تفسیر "سراج البیان" ہے جو ۱۹۳۵ء سے ۱۹۶۶ء تک پندرہ مرتبہ چھپی۔ یہ برصغیر کی پہلی کتاب ہے جو تیس اکتیس برس میں اتنی دفعہ شائع ہوئی۔ یہ کتاب تقریباً دو ہزار صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ مولانا کا رہوارِ قلم پچاس سال سے زائد عرصے سے شاہراہِ تحقیق پر محوِ خرام تھا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



قرآن کے سلسلے کی دوسری کتاب "مطالعۂ قرآن" تصنیف فرمائی جو تین سو سے اوپر صفحات پر محتوی ہے۔

پھر "لسان القرآن" کے نام سے دو جلدیں معرضِ اشاعت میں آئیں جو حروف ابجا کی ترتیب سے قرآن مجید کا توضیحی اور جامع لغت ہے۔ اسے علوم و معارفِ قرآن اور تفسیری جواہر پاروں کا گنجینہ کہنا چاہیے۔ افسوس ہے یہ کتاب مکمل نہ ہو پائی۔ یہ سلسلہ حرفِ دال تک پہنچا تھا کہ مولانا اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔ مطبوعہ صورت میں یہ دونوں جلدیں آٹھ سو صفحات پر محیط ہیں۔ اس سے آگے تقریباً سو صفحات کا مسودہ مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا پڑا ہے۔ قرآن کے اس لغت کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ان کی بہت بڑی خواہش تھی جو پوری نہ ہو سکی۔ یہ کسی کے بس کی بات نہیں، اللہ کو یہی منظور تھا جو ہو چکا۔

مولانا اگرچہ یہ کام تیزی سے کر رہے تھے اور اپنے عام معمول سے زیادہ محنت سے کر رہے تھے، لیکن اُنھوں نے عمر کی جس منزل میں اس کام کا آغاز کیا تھا، اس کے پیشِ نظر کئی دفعہ میرے دل میں یہ خیال آیا (اور بعض دیگر حضرات نے بھی اس کا اظہار کیا) کہ اگر یہ سلسلہ اتمام کی منزل کو پہنچ گیا تو اسے معجزہ ہی قرار دیا جائے گا۔ بہر حال اگر یہ کام مکمل ہو جاتا تو لغت کے ساتھ ساتھ اسے اچھی خاصی تفسیر کا درجہ بھی حاصل ہوتا۔

ان تین کتابوں کے علاوہ قرآن کے مختلف موضوعات پر ان کے بہت سے مضامین متعدد رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہوئے۔

علم حدیث سے ان کو خاص شغف اور اور گہرا تعلق تھا۔ اس پر تنقید برداشت کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس ضمن میں ایک مستقل کتاب "مطالعہ حدیث" تصنیف فرمائی اور بے شمار مضامین تحریر فرمائے جو کئی رسائل و اخبارات میں شائع ہوئے۔

سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ضبطِ تحریر میں لانے کا سلسلہ اُنھوں نے "چہرہ نبوت قرآن کے آئینے میں" کے دلکش عنوان سے شروع کیا تھا۔ ان کا مقصد قرآن کی روشنی میں آنحضرت کی حیاتِ طیبہ کو معرضِ کتابت میں لانا تھا۔ افسوس ہے یہ سلسلہ اتمام کو نہ پہنچ سکا۔ تاہم کتابی شکل میں یہ اب بھی تین سو صفحات کی کتاب ہو سکتی ہے جو اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہوگی۔

" اساسیات اسلام" اپنے موضوع میں ان کی ایک اہم کتاب ہے، جس میں اسلام کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



بنیادی تقاضے بیان کیے گئے ہیں ۔

اسی طرح مسئلہ اجتہاد ، افکار ابن خلدون ، افکارِ غزالی ، سرگزشت غزالی ، تعلیماتِ غزالی ، عقلیاتِ ابنِ تیمیہ ، تہافتہ الفلاسفہ کی تلخیص و تفہیم اور اس پر طویل مقدمہ ، قدیم یونانی فلسفہ (غزالی کی مقاصد الفلاسفہ کا اردو ترجمہ) مسلمانوں کے عقائد و افکار (ابوالحسن اشعری کی مقالات الاسلامیین کا دو جلدوں میں ترجمہ) وغیرہ ان کی وہ کتابیں ہیں جو ہر اعتبار سے انتہائی اہمیت کی حامل ہیں ۔

مولانا ندوی نے متنوّع موضوعات کو ہدفِ بحث ٹھہرایا اور ان میں خوب دادِ تحقیق دی ۔ تفسیر ، حدیث ، اجتہاد ، سیرتِ رسول ، اسلامی فلسفہ وغیرہ عنوانات پر اُنھوں نے جس نہج سے لکھا ، وہ انھی کا حصّہ ہے ۔ زبان و بیان نہایت عمدہ اور ادبیت سے مزیّن ۔ ان موضوعات میں اتنی وسعت ہے کہ ان میں سے ہر موضوع پر اصحابِ تحقیق کے لیے پی ، ایچ ، ڈی کا ایک ایک مقالہ ہو سکتا ہے ۔

مولانا کی " لسان القرآن " کے بارے میں ایک لطیفہ بھی نوکِ قلم پر آ گیا ہے ۔ ۱۹۸۵ء کے نومبر کی بات ہے کہ ایک مشہور خاندان کے ایک عالمِ دین نے مجھ سے پوچھا کہ " مولانا محمد حنیف ندوی آج کل کیا لکھ رہے ہیں ؟ "

میں نے بتایا کہ وہ " لسان القرآن " کے نام سے قرآنِ مجید کا لغت لکھ رہے ہیں جس کی پہلی جلد شائع بھی ہو چکی ہے ۔

بولے " قرآن مجید کا لغت کیا ہوتا ہے ؟ "

میں حیران ہوا کہ ایک عالمِ دین کو اس کا کیا جواب دوں ۔ عرض کیا :

" حروفِ تہجی کی ترتیب سے اُنھوں نے یہ کام شروع کیا ہے ۔ مثلاً آدم کا کیا مطلب ہے ، ابراہیم کس شخصیت کا نام تھا ، انسان کے کیا معنے ہیں ، جنّ کون سی مخلوق ہے ، جہنم کا اطلاق کس پر ہوتا ہے ۔ اس طرح بہت سے الفاظ گنواتے کے بعد آخر میں عرض کیا کہ مثلاً جہل کیا ہے اور جاہلیت کا کیا مفہوم ہے ۔ "

وہ چوں کہ عالمِ دین ہیں اور عربی کے آدمی ہیں ، سوچا کہ اس موضوع کی کسی عربی کتاب کا نام ہی ان کے سامنے لینا چاہیے ۔ لہٰذا بتایا کہ مولانا اسی طرح قرآن کا لغت لکھ رہے ہیں ، جیسے امام راغب اصفہانی کی مفردات القرآن ہے ۔ فرق یہ ہے کہ مفردات القرآن مختصر ہے ، مولانا کا لغت جامع اور توضیحی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہے، جس میں بہت سے الفاظِ قرآن کے مطالب وضاحت و جامعیت سے بیان کیے گئے ہیں ۔ وہ مفردات القرآن کے حروف کو کسی قدر طوالت دیتے ہوئے بولے:

مفردا ـــ ت ـــ القرآ ـــ ن

میں سمجھ گیا کہ قصور ان کا نہیں، میرا ہے جس نے ان کے سامنے ایسی بات کی جو ان کے ذہن سے ہم آہنگ نہیں۔ اس کے بعد دس بارہ منٹ ہم اکٹھے رہے، نہ انھوں نے کوئی بات کی اور نہ میرے لیے کچھ عرض کرنے کی گنجائش چھوڑی۔

دوسرے دن دفتر آکر مولانا کو یہ لطیفہ سنایا۔ پہلے تو سُن کر حسبِ عادت مسکرائے۔ پھر کہا! انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وضع قطع اور ہیئیتِ کذائی کے اعتبار سے مولانا کا انداز ہماری تہذیب کے انیسویں صدی کے آخری اور بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے اساتذۂ فن سے ملتا جلتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ غالب، ذوق، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری اور حالی و شبلی کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بالوں کی تراش خراش، شکل و شباہت، چال ڈھال، گفتگو، رکھ رکھاؤ اور وضع داری، لب و لہجہ، خوش ذوقی اور خوش مزاجی میں انہی کی مجلس کے آدمی معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض کی غربت و تنگ دستی اور گھریلو معاملات سے بے پروائی کے اوصاف بھی مولانا میں پائے جاتے تھے۔

موجودہ عہد کے علمائے برصغیر میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے مزاج اور فہم و فکر کے تنہا عالم تھے۔ نہایت روشن خیال، عالی فکر، صاف ذہن اور وسیع ظرف و ضمیر کے مالک۔ بعض لوگوں نے ان کے بعض افکار پر تنقید تو کی جسے انھوں نے کبھی کوئی اہمیت نہ دی، لیکن طرزِ بیان و ادا اور اسلوبِ دلائل و استنباط میں یہ لوگ ان کا مقابلہ نہ کر سکے اور نہ حقائق کا جواب، حقائق کی روشنی میں دے سکے۔

انھوں نے بیماری سے بہت عرصہ پہلے ہی عام مجلسوں میں شریک ہونا اور تقریر و خطابت کی محفلوں میں جانا بند کر دیا تھا۔ اگر کسی کے اصرار پر بامرِ مجبوری جانا بھی پڑا تو خاموش بیٹھے لوگوں کی باتیں سنتے رہے، خود بہت کم بات کی۔ البتہ اگر درسِ قرآن کے لیے کہا جاتا تو تیار ہو جاتے اور اس میں نہایت علمی نکات بیان فرماتے۔ آخری علمی اور تدریسی مجلس جس میں وہ شریک ہوئے، دار العلوم تقویۃ الاسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



(شیش محل روڈ، لاہور) کی نھی ہوئی ان کی وفات سے تین مہینے قبل ۱۳۔اپریل ۱۹۸۷ء (۱۲رشعبان ۱۴۰۷ھ) کو اختتامِ صحیح بخاری کے سلسلے میں منعقد ہوئی۔

اس مجلس میں ان کو شرکت پر آمادہ کرنے کے لیے دارالعلوم کے اربابِ انتظام نے ان سے رابطہ کیا تو انھوں نے اپنی جسمانی کمزوری اور بیماری کی بنا پر معذرت کر دی، واقعتہً وہ اس معذرت میں حق بجانب تھے۔ پھر اصحابِ انتظام نے مجھ سے کہا کہ میں انھیں شرکت پر آمادہ کروں۔ میں پروفیسر محمد یحییٰ (انجینئرنگ یونیورسٹی) کے ساتھ مولانا کے گھر پہنچا اور ان سے بات کی، پہلے تو انھوں نے انکار کر دیا۔ پھر میرے کہنے پر مان گئے۔ لیکن شرط یہ عائد کی کہ تقریر نہیں کریں گے، صرف پندرہ منٹ وہاں بیٹھیں گے۔ وہ انھیں محض تبرکاً لے جانا چاہتے تھے۔ دوسرے دن دس بجے کے بعد وہ انھیں لے گئے۔ پندرہ منٹ کے بجائے پینتیس منٹ وہاں تشریف فرما رہے۔ تقریر وغیرہ نہیں کی، کمزوری کی وجہ سے تقریر کر بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ کسی تدریسی اور تعلیمی مجلس میں ان کی زندگی کی آخری شرکت تھی۔

مولانا ندوی جسم و جان کے اعتبار سے ہماری اس آب و گل کی دنیا میں نہیں رہے۔ لیکن ان کا کام جو انتہائی وقیع ہے، ہمیشہ باقی رہے گا اور لوگ رہتی دنیا تک اس سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ انھوں نے علم و فضل کا جو گلستان سجایا ہے، اس کی مہک قیامت تک باقی رہے گی اور بہت سے گلچیں اس گلستان سے اپنی اپنی پسند کے گل چنتے اور مشامِ قلب و ذہن کے لیے اس سے خوش بو حاصل کرتے رہیں گے۔

مولانا حنیف ندوی ۱۰۔جون ۱۹۰۸ء کو گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۔جولائی ۱۹۸۷ء کو ان کا لاہور میں انتقال ہوا۔ اس طرح شمسی حساب سے انھوں نے ۷۹ سال ایک مہینہ دو دن عمر پائی۔

میری ان سے پہلی ملاقات ۱۹۳۹ء کی سردیوں میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء تک کئی دفعہ ان سے ملاقات کے مواقع میسر آئے، لیکن ۱۹۴۸ء میں ہمارے تعلقات نے ایک نہایت خوش گوار کروٹ لی۔ اس وقت سے لے کر ان کی تاریخِ وفات تک ہمارے باہمی مراسم میں روز بروز استحکام پیدا ہوتا گیا۔ ان کی وفات کے بعد اس بھری پڑی دنیا میں، میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہوں۔ وہ میرے مشفق، کرم فرما اور انتہائی خیر خواہ تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



۱۵ - مئی ۱۹۵۱ء کو وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوئے۔ اپنی وفات تک (چھتیس سال دو مہینے) وہ ادارے سے منسلک رہے۔

مولانا ندوی نہایت بلند اخلاق، عالی کردار، خوش مزاج اور باغ و بہار عالم دین تھے۔ میں ان کو بہت قریب سے جانتا ہوں اور ان کی زندگی کے تمام پہلوؤں سے واقف ہوں۔ وہ انتہائی خوددار تھے۔ اُنھوں نے اپنی خودداری اور وضع داری کو کبھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ وہ کرائے کے مکان میں رہتے تھے اور مکان یا پلاٹ خریدنے کی مالی اعتبار سے ان میں سکت نہ تھی۔ وہ کبھی کسی سرمایہ دار کے ہاں نہیں گئے، انھوں نے کبھی کسی کی جیب کے بوجھ کو قابلِ اعتنا نہیں گردانا، کبھی کسی کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار نہیں کیا اور کبھی کسی سے اس لب و لہجے میں بات نہیں کی کہ مخاطب کے دل میں ان کے لیے جذبۂ ترحم پیدا ہو، اور وہ ان کی اعانت کرے۔ وہ بے شمار خصوصیات کے حامل تھے اور اس ضمن میں طبقۂ علما میں کوئی ان کا حریف یا مدِمقابل نہیں تھا۔ وہ اپنے انداز کے منفرد عالم تھے۔

بعض حضرات نے مولانا حنیف ندوی کو علامہ سید سلیمان ندوی کا شاگرد لکھا ہے۔ وہ اس اعتبار سے سید صاحب کے شاگرد نہ تھے کہ اُنھوں نے سید صاحب سے کچھ پڑھا ہو۔ البتہ ان کے زمانۂ طالب علمی میں سید صاحب دارالعلوم ندوۃ العلما کے معتمدِ تعلیمات تھے۔ ندوہ لکھنؤ میں ہے اور سید صاحب دارالمصنفین (اعظم گڑھ) میں مستقل طور پر سکونت پذیر تھے۔ تین چار مہینے کے بعد وہ دارالعلوم ندوۃ العلما کے بعض انتظامات کے سلسلے میں لکھنؤ تشریف لے جاتے تھے اور اساتذہ و طلبا سے وہاں ان کی گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اس حیثیت سے اگر مولانا ندوی کو سید صاحب کے شاگرد کہا جائے تو الگ بات ہے، ورنہ اُنھوں نے براہِ راست سید صاحب سے کچھ پڑھا نہیں۔

مولانا حنیف ندوی کی موت تنہا ایک شخص کی موت نہیں ہے۔ ایک خاص قسم کے رکھ رکھاؤ اور وضع داری کی موت ہے، تہذیب و ثقافت کی صاف ستھری روایت کا خاتمہ ہے، فضل و کمال کی بلندیوں کے رو بہ زوال ہونے کا ماتم ہے، تحقیق و کاوش کی اعلیٰ قدروں کی جان کنی ہے، زبان و انداز کے پُرشکوہ اسلوب کے ختم ہو جانے کا دردناک نوحہ ہے اور تصنیف و تالیف کے پاکیزہ ذوق کو شدید دھچکا لگنے پر اظہارِ حزن و ملال ہے۔

اپنے دور کی ندوی برادری کے مولانا حنیف ندوی آخری رکن تھے، ان کی وفات کے ساتھ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



ہی بیسوی صدی کے دوسرے عشرے کے ندوی دور کا خاتمہ ہوگیا ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا دور ان کے بعد کا ہے ۔

مولانا حنیف ندوی علم وفضل کی محفلِ دوشیں کی وہ شمعِ فروزاں تھے جن کی تصنیفات و تحقیقات کی ضوفشانیوں کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہے گا اور جن کے کمالاتِ علمیہ سے اصحابِ ذوق رہتی دنیا تک کسبِ ضیا کرتے رہیں گے ۔

وہ اگرچہ عمرِ طبعی کو پہنچ گئے تھے، لیکن ان کا شمار ان اربابِ فضیلت میں ہوتا ہے، جن کی منازلِ عمر کو ماہ وسال کے پیمانوں سے نہیں ماپا جاتا ، بلکہ اللہ سے ان کے لیے مزید درازیٔ عمر کی دُعا کی جاتی ہے، تاکہ ان کی علمی فیض رسانیوں کا دائرہ اور وسیع ہو اور ان کی تحقیق وکاوش کے حلقے زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ اختیار کریں ۔

موت وحیات کے ہمہ گیر قاعدے کے مطابق ہر متنفس کو مرنا ہے ۔ مولانا کو بھی ایک دن مرنا تھا اور وہ موت کا لقمہ بن گئے ۔ لیکن موت اور موت میں فرق ہے ، انسان اور انسان میں بھی فرق ہے ۔

قضا کس کو نہیں آتی ہے، یوں تو سب ہی مرتے ہیں
پہ اس مرحوم کی بوٹے کفن کچھ اور کہتی ہے

مختلف مسائل ومعاملات سے متعلق مولانا ندوی نہایت عمدہ تجزیہ کرتے تھے ۔ ایک دن عام علمائے دین اور صوفیائے کرام کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ تبلیغ حق کے سلسلے میں دونوں ایک ہی قسم کی بات کہیں گے ، لیکن دونوں کے لب ولہجے اور اسلوبِ کلام میں نمایاں فرق ہوگا ۔

عالم دین کلمۂ حق کہنے میں انتخابِ الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں دے گا ۔ نرم یا سخت جو الفاظ زبان پر آئے بلا تامّل کہہ دے گا ، یہ خیال نہیں کرے گا کہ مخاطب پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے ۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ حق کڑوا ہوتا ہے اور اس کی کڑواہٹ کا اثر مخاطب کے حلق اور معدے تک پہنچنا چاہیے ۔ لیکن صوفی اور عارف اس طرزِ ادا کو نہیں اپنائے گا ۔ وہ سخت سے سخت بات کہنے کے لیے بھی نرم سے نرم الفاظ تلاش کرے گا ۔ اس کی کوشش یہ ہوگی کہ اپنی بات بھی کہہ دی جائے اور مخاطب کو ذہنی اور قلبی تکلیف بھی نہ پہنچے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



مولانا کی یہ بات بالکل صحیح ہے۔ آج کل اکثر مبلغین کو ہم دیکھتے ہیں کہ انتخابِ الفاظ کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ ایسا ترش اور کڑوا انداز اختیار کرتے ہیں کہ مخاطب پر اچھا اثر پڑنے کے بجائے بُرا اثر پڑتا ہے۔ حالاں کہ قرآن کا واضح حکم ہے کہ نرم و ملائم لفظوں میں تبلیغ کرنی چاہیے اور نوبت جھگڑے تک بھی پہنچ جائے تو گفتگو میں احسن طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

موت کے بارے میں مولانا ندوی کہا کرتے تھے کہ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ موت، تغیرِ مقام اور تغیرِ احوال کا نام ہے۔ جو شخص اس کارگاہِ آفرینش میں اس ڈھب سے زندگی بسر کرتا ہے کہ جو موت کے بعد پیش آنے والے ماحول و اسلوب سے ہم آہنگ ہو سکے، اس کی وہاں پہنچتے ہی اس ماحول اور اس طرزِ حیات سے مطابقت پیدا ہوجاتی ہے اور اُسے وہاں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ گویا ابتدا ہی سے اسی ماحول اور اسی نواح سے اس کا تعلق ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اس دُنیا میں رہ کر بعد از موت کے اسلوبِ زیست کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، وہاں اُنھیں بلاشبہ دِقت پیش آئے گی۔ تھوڑی بہت اذیت اُٹھانے اور کچھ عرصہ گزارنے کے بعد بہ تدریج اس ماحول سے ان کی موانست و مطابقت پیدا ہوگی۔

وہ فرمایا کرتے تھے کہ اس دُنیا میں بھی ماحول کی عدم مطابقت اور اجنبیت کی وجہ سے عام طور پر ہمیں یہ دِقت پیش آتی ہے۔ مثلاً ہم کسی ایسے علاقے یا ملک میں چلے جاتے ہیں جہاں کی زبان، ثقافت، تہذیب اور طرزِ معاشرت سے واقفیت نہیں ہوتی تو جب تک اس سے ذہنی مطابقت اور لسانی مناسبت نہیں پیدا ہوجاتی، احساسِ اجنبیت قائم رہتا ہے۔ جوں ہی مناسبت و مطابقت پیدا ہوئی، غیریت اور دوئی کے تمام حجاب ختم ہوجاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال انسان کی قلبی اور عملی استعداد سے تعلق رکھتی ہے۔ اگر یہ استعداد تیز ہے تو مطابقت جلد پیدا ہوجاتی ہے اور اگر اس میں کمی ہے تو مطابقت کی رفتار ظاہر ہے، کم رہے گی۔

یہ بات خالص عارفانہ ہے اور معرفت و سلوک کا کوئی ماہر ہی یہ بات کہہ سکتا ہے۔ اتنی بڑی حقیقت کو اس درجہ حکیمانہ پیرائے میں کوئی عام عالم بیان نہیں کر سکتا۔

مولانا کہا کرتے تھے کہ ہمارا خدا اپنے بندوں کو ان شاء اللہ عذاب و عقاب کی ناقابلِ برداشت شدت سے دوچار نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ وہ رحمٰن ہے، رحیم ہے، رؤف ہے، غفور ہے، غفار ہے، تواب ہے۔ وہ اپنے بارے میں خود کہتا ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



رَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ ۔ (الاعراف : ۱۵۶)

میری رحمت (کی فراوانی) کا حال یہ ہے کہ ہر شے پر چھائی ہوئی ہے ۔

بلاشبہ اللہ کی ردائے رحمت ہمہ گیر ہے اور دُنیا کی ہر چھوٹی بڑی شے کو اس نے گھیر رکھا ہے ۔ اس جہان ہست و بود میں اس کی رحمتوں کا فیضان اس قدر عام ہے کہ اس کو حیطۂ شمار میں لانا اور اس کی وسعتوں کا اندازہ کرنا ممکن نہیں ۔ جدھر دیکھو رحمتِ الٰہی کے فیوض ہی نظر آئیں گے ۔ اس لیے کہ بارگاہِ خداوندی سے فقط رحمت ہی کا صدور اور ظہور ہوتا ہے ۔

کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ط (الانعام : ۱۲)

اس (اللہ) نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ رحمت فرمائے ۔

کائنات کے گوشے گوشے میں اس کے فضل و رحمت کی بارش ہو رہی ہے اور اس کا یہ قانون اور اصول ہے کہ زمین و آسمان کے دور دراز کناروں تک اپنی رحمت کو پھیلا دے اور ہر چیز کو اس سے مستفیض ہونے کے مواقع مہیا کرے ۔

محمد حنیف ! تو نے خودداری کی زندگی بسر کی ۔ کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے ، جو کچھ مانگا اللہ سے مانگا ۔ تجھ پر دُنیائے فانی میں کئی دور آئے ، اللہ نے ہر موقعے پر تیری مدد فرمائی ۔ تو عمر بھر اللہ اور اس کے رسول کے دین کی خدمت کرتا رہا ۔ حدیثِ رسول پر جب کسی نے حملہ کیا ، تیرا قلم جوش میں آگیا ، تو نے حدیثِ رسول کا دفاع بھی کیا اور معترضینِ حدیث پر حملے بھی کیے ۔ تیری زندگی کے لمحات خدمتِ قرآن میں گزرے ۔ تو اللہ کے کلام اور سینۂ لاہوت کے آخری بول کی خدمت میں مصروف تھا کہ تجھ پر مرض الموت نے حملہ کیا ، تو اسی حالت میں آسودۂ لحد ہوا اور اطمینان کی نیند سویا ۔ قرآن بھی تیرا شفیع ہوگا اور صاحبِ حدیث (صلی اللہ علیہ وسلم) بھی تیری شفاعت فرمائیں گے ۔ تو ہماری اس عارضی دنیا میں ہمیشہ اور ہر حالت میں مطمئن اور پُرسکون رہا ۔ ہم عاجز بندوں کو یقین ہے کہ اللہ کے نزدیک بھی جہاں دوام کی زندگی ہے ، تو اطمینان و سکون میں ہے ۔ اپنی حسنات کے پیشِ نظر اب تو عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوگا ، قبول و مغفرت کے پھول تجھ پر نچھاور کیے جا رہے ہوں گے ۔ موت کے بعد بارگاہِ اقدس سے تجھے یہ مسرّت انگیز ندا آئی ہوگی :

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ۝ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ۝

© rasailojaraid.com